Majallah Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 37, Sr.No.104, 2016 pp 89 - 104

مجلّہ تحقیق
مجلّہ کلیہ علوم شرقیہ
جلد ۳۷، جولائی۔ستمبر ۲۰۱۶ء، شمارہ ۱۰۴

مجید امجد کی نظم ''مرے خدا مرے دل'' کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر نبیل احمد نبیل ☆

Abstract:

"Meray Khuda Meray Dil"

This poem by Majeed Amjad may safely be placed as one of the representative poems by the most prolific and influencing poet of our times. Panel down in 1964, this poem relates to the period, when modernist in Majeed Amjad had been largely accomplished. Thus it truly and most comprehensively portrays the creative vision of this master poem writer and tends to unfold the un-matching craft of this legendary poet. Woven in the mysterious yet compelling frame of time and nature, this poem very skillfully discovers chained man. Nevertheless, the tone and toner of this poem is not foreign for the reader of Urdu poetry, yet the eloquence of creative experience and keen observation of the complexities of life of universe coupled with unassumingly innovative diction of the poet misfalls this poem, among the hall- marks of modern Urdu poetry. Majeed Amjad, as a stylist, is not only well-accompanied for the refreshing images and magical vocabulary he uses, but also for the sublime pathos and blood in the human veins. Article below is an academic effort of launching a serious discourse based on some critical appreciation of the poem, which has the enormous potential to open vistas of further and better criticism in times that are present.

Key Words: Majeed Amjad, Frame of time and Nature, Complexities of life of Universe, Sublime Pathos, Magical Vocabulary, Blood in the Human Veins.

☆ اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال کیمپس، لاہور۔

مرے خدا مرے دل!
مرے ضمیر کے بھیدوں کو جاننے والے،
تجھے تو اس کی خبر ہے، مرے خدا، مرے دل،
کہ میں ان آندھیوں میں عمر بھر، جدھر بھی بہا
کوئی بھی دُھن تھی میں اس لہر کی گرفت میں تھا
جو تیری سوچ کی سچائیوں میں کھولتی ہے
ہے جس کی رو میں تری ضو، مرے خدا، مرے دل
مرے لہو میں تری لو ، ہے دھڑکنوں کا الاؤ
تجھے تو اس کی خبر ہے، مرے خدا، مرے دل
کہ اس طلسمِ زیاں کے کسی جھمیلے میں،
ذرا کبھی جو قدم میرے ڈگمگا بھی گئے،
تو اِک خیال، ابد موج سلسلوں کا خیال
مرے وجود میں چنگاریاں بکھیر گیا،
سنبھل کے دیکھا تو دنیا میں اور کچھ بھی نہ تھا
نہ دُکھتی سانس کے ارماں، نہ جیتی مٹی کے لوبھ
نہ کوئی روگ، نہ چنتا، نہ میں، نہ میرے جتن
جو مجھ میں تھا بھی کوئی گُن ترے ہی گیان سے تھا
کچھ اور ڈوب کے گہرائیوں میں جب دیکھا
تو ہر سُلگتی ہوئی قدر کے مقدر میں
نہاں تھے تیرے تقاضے، مرے خدا، مرے دل
ہیں تیری کرنوں میں کڑیاں چمکتے قرنوں کی
تجھے تو اس کی خبر ہے ، مرے خدا، مرے دل

کہ اس کرے پہ ہے یہ جو کچھ بھی اُس کے پہلو میں ہیں
وہ شعلے، جن پہ شکن ہے، تری ہی کروٹ کی
ترے ہی دائرے کا جزو ہیں وہ دور کہ جب
چٹانیں پگھلیں، ستارے جلے، زمانے ڈھلے
وہ گردشیں جنھیں اپنا کے اَن گنت سورج
ترے سفر میں بُجھے تو اِنھی اندھیروں سے
دوامِ درد کی اِک صبح اُبھری، پھول کِھلے
مہک اُٹھی تری دُنیا، مرے خدا، مرے دل
گُھلا ہوا مری سانسوں میں ہے سفر تیرا
تُجھے تو اس کی خبر ہے، مرے خدا، مرے دل،
کہ گو یہی ، مرا پیکر، ضمیرِ خاک سے ہے،
مگر اسی مرے تپتے بدن کی بھٹّی سے
کشید ہوتی ہوئی ایک ایک ساعتِ زیست،
وہ گھونٹ زہر کا ہے جو مجھی کو پینا پڑا
یہ زہر کون پیے؟ کون اپنے سینے میں
یہ آگ انڈیل کے، اُن ساحلوں سے بھید چُنے
جہاں پہ بکھرے ہیں صد ہا صِداقتوں کے صدف!
یہ زہر کون پیے؟ کون بُجھتی آنکھوں سے
غروبِ وقت کی خندق کے پار دیکھ سکے
جہاں ازل کے بیاباں میں عمر پیما ہے
حقیقتوں کا وہ دھارا، کہ جس کی لہروں میں آج
گلوں کا رس بھی ہے فولاد کا پسینہ بھی!

مرا شعور انھی گھاٹیوں میں بھٹکا ہے
قدم قدم پہ مری ٹھوکروں کی زد میں رہیں
کرخت ٹھیکریاں ان کٹھور ماتھوں کی
جو زندگی میں ترے آستاں پہ جُھک نہ سکے
قدم قدم پہ سیہ فاصلوں کے سنگم پر
بس اِک مجھی کو اس اَن مِٹ تڑپ سے حصہ ملا
تری جرس کی صدا میں ہیں رَت جگے جس کے
یہی تڑپ تری کایا، یہی تڑپ، مرا اَنت
جو اَنت بھی ہو، سو ہو، میں تو مٹتی مٹی ہوں
دھڑکتی ریت کے بے اَنت جھکڑوں میں سدا
رواں رہیں، ترے محمل! مرے خدا، مرے دل،
تری ہی آگ کی میٹھی سی آنچ ہیں مرے دُکھ
یہ راز تُو ہی بتا اب، مرے خدا، مرے دل
یہ بات کیا کہ ترے بے خزاں خزانوں سے
جو کچھ ملا بھی ہے مجھ کو تو اِک یہ ریزۂ درد،
ہیں جس کی جھولی میں کھلیان تیرے شعلوں کے
اور اب کے سامنے، جلتی حدوں کی سرحد ہے
ہر ایک سمت مری گھات میں ہیں وہ رُوحیں
جو اپنے آپ میں اِک راکھ کا سمندر ہیں
یہ رُوحیں، ڈس بھرے،ذی جسم، آہنی سائے
انھی کے گھیرے میں ہیں اب یہ بستیاں ،یہ دیار
کہیں یہ سائے جو پتھرائی آرزوؤں کو

سرابِ زر کی کشش بن کے گُدگداتے ہیں
مری لگن کو نہ ڈسنے لگیں، میں ڈرتا ہوں
کہیں یہ سائے، یہ کیچڑ کی مُورتیں، جن کے
بدن کے دھبوں پہ رختِ حریر کی ہے پھَبن،
مری کرن کی نہ چھَب نوچ لیں، میں ڈرتا ہوں
کہیں یہ آگ نہ بُجھ جائے جس کے انگ میں ہیں
ترے دوام کی انگڑائیاں، میں سوچتا ہوں،
نہیں ، یہ ہو نہ سکے گا! جو یوں ہوا بھی تو پھر؟
نہیں! ابھی تو یہ اِک سانس! ابھی تو ہے کیا کچھ!
ابھی تو جلتی حدوں کی حدیں ہیں لا محدود،
ابھی تو اس مرے سینے کے ایک گوشے میں
کہیں، لہو کے تریڑوں میں، برگِ مرگ پہ اِک
کوئی لرزتا جزیرہ سا تیرتا ہے جہاں
ہر اِک طلب تری دھڑکن میں ڈُوب جاتی ہے
ہر اِک صدا ہے کوئی دُور کی صدا، مرے دل
مرے خدا، مرے دل(۱)

مجید امجد اپنی نظم 'مرے خدا مرے دل' میں دُنیا کی ناہمواری اور طبقاتی نظام کے خلاف ہیں۔ مجید امجد کی اس نظم کو پڑھنے سے کشادگی کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے اس نظم میں کیا کیا زاویے نکالے ہیں۔ اس نظم کا مخاطبہ کیا ہے؟ پہلا سوال تو یہ ہے۔ ایک تو اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ شاعر نے اپنے دل کو خدا کے متقابل نہیں بلکہ مماثل کیا ہے، مجید امجد نے دل اور خدا کو ایک ہی سکتے کے دو رُخ تصور کیا ہے۔ جیسے پنجابی کے ممتاز صوفی شاعر نے کہا ہے:

دل دریا سمندروں ڈونگھے کون دلاں دیاں جانے ہُو

مجید امجد نے دل اور خدا کو ایک دوسرے کے مماثل کیا ہے، وہ اپنے دل سے مخاطب ہے۔ دل کی

دو کیفیات ہیں۔ دل کے دو محسوسات ہیں۔ وہ ان میں اور خدا میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتا، اس ساری خدائی کا مرکز انسان کا دل ہے۔ اس میں وہ ابتدائے آفرینش کا تخلیقی پیرائے میں ذکر کرتا ہے۔ وہ زر پرستی کو بھی موضوع بناتا ہے۔ درویشی کا بھی ذکر لے آتا ہے۔ وہ کائنات کی حیرت بھی اس کے پیشِ نظر ہے۔ کائنات کے انجام پر بھی وہ سوچتا ہے۔ شاعر کے اپنے اندر جو احساسات کا جوار بھاٹا ہے، وہ اس نظم کے اندر آ گیا ہے اور سامنے کی اور اندر کی سچائیاں اور پھر شاعری کا انوکھا پن بھی اس میں آ گیا ہے۔ یہ انوکھے پن کی نظم ہے، اس نظم میں ندرت بے مثال ہے، ظاہر ہے، نیا موضوع تو کم ہی ہوتا ہے، لیکن اس موضوع کے اندر انھوں نے جو زاویے اور زایچے بنائے ہیں اور جو مختلف پہلو نکالے ہیں، وہ شاعر کی قادرالکلامی پر دلالت کرتے ہیں، شاعر کے فلسفی ہونے کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں، مذکورہ نظم کے ایمائی پہلو اپنی مثال آپ ہیں۔ مجید امجد کا اس نظم میں شعری وفور اور شعریت عدیم النظیر اور بھرپور ہے۔ اس نے اس نظم کو کمال کی چیز بنا دیا ہے۔ موضوع تو وہی ہے کہ وہ خدا اور دل کو ایک دوسرے کے مماثل ٹھہراتا ہے اور انسان، کائنات اور جو زندگی کی تقویم ہے اور جو مضامین ہیں اور اس کے اندر جو ابلاغ ہے، ان کے بارے میں وہ صرف رائے زنی کر کے نہیں رہ جاتا بلکہ اس کے اوپر ایک بھرپور شاعرانہ نظر ڈالتے ہوئے، یہ نظم مجید امجد کو ایک فلسفی شاعر کے قریب لے جاتی ہے۔ شعری طلسم، مضمون آفرینی اور ندرت کے جو کمالات اس نے دکھائے ہیں، وہ مجید امجد کی انفرادیت کا بین ثبوت ہیں۔

اس نظم کے عمومی احساس سے اس امر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس نظم میں وہ دل اور خدا دونوں سے مخاطب ہے۔ خدا بھی بھیدوں کو جانتا ہے اور دل بھی انسان کے بھیدوں کو جانتا ہے۔ آدمی وقت کے بہاؤ میں تنکے کی طرح بہتا جاتا ہے۔ وقت انسان کو بہائے لے جاتا ہے۔ وہ عمر بھر اس میں بہتا ہے، لیکن کوئی بھی دُھن ہو، وہ خیر پر یقین رکھتا ہے۔

ہر چند کہ شاعر کو وقت کا تسلسل یا واقعات کی رو اپنے جلو میں بہا لے گئی ہے، لیکن بات یہ ہے کہ شاعر اس لہر کی گرفت سے کبھی باہر نہیں آیا۔ وقت بے شک اسے اپنی مرضی سے چلاتا رہا۔ شاعر وقت کے دھارے کے اوپر بہتا رہا، وقت کے رُخ کے اوپر بہتے ہوئے بھی، وہ اس لہر کی گرفت میں تھا جو تیری گرہیں کھولتی ہے اور تیری صداقتوں کی طرف لے جاتی ہے۔ شاعر، کائنات اور خدا کے رازِ سربستہ کو سمجھنے میں مصروفِ کار رہے۔ وہ اس انداز سے محوِ فکر ہے کہ میں نرا مجہول یا مفعول نہیں تھا، ہر چند کہ خارجی طور پر وقت

نے اپنے دھارے میں مجھے بہانا چاہا، لیکن میں تیری تلاش اور تیرے سچ کی کھوج میں سرگرداں رہا۔ اگرچہ وقت کا دھارا مجھے اپنے بہاؤ پر بہاتا رہا، باوجود اس کے میں، تیرے ہونے، تیری کائنات میں جو کارفرمائی ہے، اس کی تلاش میں، وقت کے دھارے پر بہتے ہوئے بھی، میں اُس کھوج سے غافل نہیں رہا۔

مجید امجد اپنے اُسی Thesis کو آگے پھیلا رہا ہے کہ میں وقت کا تابع مہمل نہیں تھا۔ میں وقت کے تھپیڑے سہتا رہا، لیکن وقت کے تھپیڑے سہتے ہوئے بھی، اگر کبھی کبھی میرے قدم ڈگمگا بھی گئے۔ وقت کے تھپیڑوں سے اپنے کو سنبھالا اور سنبھل کے دیکھا تو دنیا میں اور کچھ بھی نہ تھا۔

شاعر اب یہاں اپنی ہستی کی نفی کر رہا ہے۔ یہاں وہ اپنے خیالات، جذبات اور محسوسات کی نفی کر رہا ہے کہ وقت کے تھپیڑوں سے ذرا بھی جو سنبھلا تو میرے اندر کوئی روگ، کوئی چِتنا نہیں تھی اور اگر کچھ تھا، تو وہ تیرے گیان سے تھا، تیرے گیان سے سب کچھ تھا۔ یعنی کائنات کا جتنا نظام اقدار ہے، اخلاقی ہو، معاشی ہو، کائنات، آخر کسی نظام کے اوپر چل رہی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ کائنات اور نظامِ کائنات کی کوئی بھی قدر تیرے حسن سے، تیرے وجود سے اور تیری ذات کے پرتو سے خالی نہیں ہے۔ یہاں شاعر وحدت الوجود کی طرف لے جاتا ہے۔ مادھو لال حسین کی ایک کافی کے بول وحدت الوجودی فکر کی آئینہ داری کرتے ہیں:

کہے حسین فقیر نمانا
میں ناہیں سب تُوں(۲)

ذرّے میں کُل کو شامل کر دینے کی کیفیت ہے، ذرّہ، کُل سے توانائی لیتا ہے، لیکن کُل میں انضمام کرنے کا بھی آرزو مند ہے یعنی وہ ''کُل'' خدا کی ذات کا مرکز ہے۔ اپنی ذات کی نفی کر کے، کہ مجھ میں نہ کوئی چِتنا ہے، نہ کوئی روگ ہے، نہ کوئی جتن ہے، کچھ بھی نہیں ہے، جب ذرا تفکر کیا، جب ڈوب کر دیکھا تو ہر سُلگتی ہوئی قدر کے اندر تیرے تقاضے تھے۔ یہ جو نظام اقدار ہے، یہ جب زوال آمادہ ہوتا ہے تو قدریں بھی سُلگنے لگتی ہیں۔ یہ شاعر کا احساس ہے۔ زوال آمادگی میں قدریں بھی سُلگنے لگتی ہیں اور پھر جب قدریں ٹوٹتی ہیں تو اس میں بھی تیرے تقاضے شامل ہیں یعنی اس کارخانۂ قُدرت کو تو چلا رہا ہے۔ یعنی

کارخانۂ شب کو محو ہوں چلانے میں
ساری عمر لگتی ہے ایک دن بنانے میں(۳)
(اظہار شاہیںؔ)

یہاں شاعر خالقِ باری تعالیٰ کی حمد بیان کر رہا ہے۔ اپنے انداز سے، وہ حمد کے سارے مضامین لایا ہے۔ یہاں شاعر ابتدائے آفرینش کو بیان کرتا ہے۔ کائنات کی آفرینش اسی طرح ہوئی ہے۔ ستاروں کا جلنا، زمانوں کا ڈھلنا۔ یہاں شاعر کا اندازِ بیان سائنسی ہے۔ یہ مذہبی Approch بھی ہے اور سائنسی Approch بھی۔ سائنس نے اب یہ ثابت کر دیا ہے کہ جب بگ بینگ (Big Bang) ہوا ہے۔ بگ بینگ (Big Bang) ہونے کے نتیجے میں بہت ہول ناک دھماکہ ہوا ہے۔ اس کے نتیجے میں پہلے سے جو چٹانیں تھیں، وہ پگھل گئیں، ستارے جلے، کائنات کے آغاز کا جو منظر نامہ ہے، جب بگ بینگ Settle ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں کائنات اور زندگی کا نئے سرے سے آغاز ہوا۔ گرے میٹر (Gray Matter) سے وہ جو بگ بینگ (Big Bang) یعنی لاوا تھا۔ اس سے پانیوں کے اوپر زمین کی تہیں بچھ گئیں۔ اس سے پودے نکلے۔ روئیدگی کے عمل کا آغاز ہوا۔ اسی سے روئیدگی پیدا ہوئی۔ اسی سے پرندوں کی چمک اُبھری۔ یہ سارا ابتدائے آفرینش کا سفر ہے۔ شاعر کا شعری احساس بہت توانا ہے جو قاری کو اپنے ساتھ ایک بہاؤ کی صورت سفر کرواتا ہے۔ شعری احساس میں Celeberate کرواتا ہے۔ ازل سے آدمی کا جو مقدر ہے، کچھ محرومیاں، کچھ درد ہیں، کچھ پچھتاوے اور مصائب و مسائل ہیں۔ یہ آدمی کے ایجنڈے (Agenda) میں شامل ہیں، 'دوامِ درد کی اک صبح ابھری، پھول کھلے'

آدمی کے ساتھ یہ جو کچھ روگ وابستہ ہیں۔ یہ دائمی ہیں، یہ اس کے ساتھ ازل سے جُڑے ہوئے ہیں، یعنی آدمی اپنے مقدر پر قادر نہیں ہے۔ آدمی اپنی موت اور زندگی پر قادر نہیں ہے۔ آدمی اپنے رزق پر قادر نہیں ہے۔ آدمی کو بہت سارے معاملات میں اپنی خواہشات کو دبانا پڑتا ہے کہ کائنات میں بہت کچھ ایسا ہے جو اُس کے اختیار میں نہیں ہے، یہ درد کی کیفیت ہے کہ ایک دوامی درد و غم جو ہے، وہ ودیعت کر دیا گیا ہے۔ وہ خدمتِ خلق بھی ہو سکتی ہے۔ وہ انسانیت کا درد بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی ایک حساس انسان تڑپتا ہے، کسی کی محرومی کے لیے تو، یہ درد و غم جبریت کے ردِ عمل کا بھی ہو سکتا ہے۔ دوامِ درد کی ایک سے زیادہ تعبیرات ممکن ہیں۔ شاعر جو منظر نامہ بنا رہا ہے، وہ ابتدائے آفرینش کا پیش منظر ہے۔ جب Gray Matter سیٹل Settle ہوا تو اس سے ایک نئی روئیدگی اور ایک نئی نمو ظاہر ہوئی، اور یہ اس نمو کے مناظر ہیں۔

سب یہ جس بار نے گرانی کی
اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا (میر)(۴)

اس کی تراکیب، اس کے تلازمے متاثر Fascinate کرتے ہیں۔ یہاں شاعری احساس کے اندر چانن کررہی ہے۔ یہ محسوساتی چیز ہے۔ یہاں شاعری محسوسات کو مہمیز کرتی ہے۔ جیسے محبت محسوس کرنے سے تعلق رکھتی ہے، اُسے بیان کرنا کوئی آسان کام نہیں جیسے ہجر کی کیفیت کو پوری طرح بیان کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ جیسے وصل کے نشاط آگیں لمحات کو بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ یہاں تفہیم کا عمل شاعری کے طلسم کو توڑ دیتا ہے۔ شاعر نے دل کو کائنات کا مرکزہ بنایا ہے، اور دل میں ساری خدائی صفات کی موجودگی کا احساس دلایا ہے، دل صرف ایک عضوِ بدن یا جسم نہیں ہے، نہ وہ Pumping Station ہے بلکہ دل تو مظہرِ کائنات ہے۔ مرکزِ کائنات بھی دل ہےاور دل سے کون سی چیز اوجھل یا پوشیدہ رہ سکتی ہے۔

بڑے شاعروں کے سوچنے کا انداز انسان، کائنات اور وقت کی تقویم کے ساتھ تعلق قائم کیے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ انسان، کائنات اور وقت کی تقویم سے متعلق گہرا تفکر کرتے ہیں۔ وہ باریک بینی سے ان معاملات پر غور کرتے ہیں۔ بڑے شعرا کا سوچنے کا انداز کم و بیش ایک سا ہوتا ہے، وہ جو مستعمل لفظیات ہیں یا مستعمل اور چالو رویے ہیں، شاعر اُن رویوں سے ہٹ کر ان سے اُوپر اٹھ کر کائنات کو ایک اور آنکھ سے دیکھتا ہے۔ یہاں شاعر کی آنکھ معمول کی آنکھ نہیں ہے۔

جب وہ معمول کی آنکھ سے ہٹ کر دیکھتا ہے تو ایک اور جہانِ معنی کھلتا ہے اور اس صورتِ حال میں وہ اپنے قاری اور سامع کو بھی شریک کرتا ہے۔ وہ زندگی کو Celebrate بھی کر رہا ہے۔ وہ زندگی کی کُلفتوں میں زندگی کرنے کا سلیقہ رکھتا ہے۔ وہ زندگی کے مصائب و مسائل میں زندگی گزارنے کا قرینہ رکھتا ہے، اس کی اپنی عمرِ شکستہ۔ ایک یہ کہ شکستِ آرزو کا ماتم، آرزو کی شکست بھی تو ہے۔ عمر کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ اس کا تعلق تو وقت کی تقویم سے یا کیلنڈر سے ہے،

مگر آرزو کی شکست بھی تو ہے۔ 'غروبِ وقت کی خندق کے پار دیکھ سکے' امیج بنایا ہے۔

خندق کا کیا کام ہوتا ہے۔ خندق کو اگر کوئی کامیابی سے پھلانگ گیا تو وہ کامیاب ہو گیا اور جو خندق میں گر گیا، وہ ضائع ہو گیا۔ وقت کے گھوڑے کے اوپر جس نے قابو پا لیا، وہ سُرخرو ہو گیا، اور جو نہ پا سکا، وہ خندق میں گر گیا۔ زندگی اور انسان کے معاملات پر مجید امجد کی نہایت گہری نظر ہے، جیسے اقبال نے اپنی نظم 'مسجدِ قرطبہ' میں مردِ درویش کے متعلق کہا ہے:

اُس کی اُمیدیں قلیل اُس کے مقاصد جلیل

اُس کی ادا دل فریب اُس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ،عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل ہے وہ(۵)

(اقبالؔ)

زندگی سختی اور نرمی کا مرکب ہے۔اس میں شدائد بھی ہیں،اوراس میں آسائشیں بھی ہیں۔زندگی میں ملائمت بھی ہے اور کُھردراپن بھی ہے۔گلوں کا رس...... درحقیقت زندگی کی ملائمت اور نرمی کی علامت ہے،تو دوسری طرف زندگی کا کھردراپن، زندگی کی کُلفتیں ہیں، شدائد ہیں۔فولاد دراصل زندگی کے شدائد کی نمایندگی کرتا ہے۔

عمر کا ہمارے پاس ایک واضح تخمینہ موجود ہے کہ فلاں کی اوسط عمر ساٹھ پینسٹھ سال ہے یا ہوئی۔ یہاں شاعر انفرادی عمر سے اوپر اٹھ جاتا ہے، یہاں مجید امجد نے عمر کو ایک ادارہ بنا کر پیش کیا ہے۔شاعر نے یہاں عمر کو زندگی کا ادارہ بنا کر پیش کیا ہے۔زندگی جسے حیات نما کہہ سکتے ہیں۔حیات اور کائنات کے جو معاملات ہیں، یہ آسان معاملات تو نہیں ہے۔فلسفی حیات کی گتھیاں سُلجھاتے رہے،نسلوں کی نسلیں معدوم ہوگئیں مگر اس کا سرا ہاتھ نہیں آیا۔وہ گھاٹیاں۔جیسے گھاٹیوں میں کوئی اجنبی مسافر گر جائے اور وہ سہارے کی تلاش میں بھٹکا پھرے اور گھاٹیاں رستہ نہ دیں۔ازل اور ابد، حیات اور کائنات کی جو پیچیدگیاں ہیں۔اس کی جو گُتھیاں ہیں، وہ گھاٹیوں کی طرح ہی ہیں۔شاعر نے ان گھاٹیوں کی اہمیت کو گھٹا دیا ہے۔جیسے یہ کہا جاتا ہے کہ میری ٹھوکر کی زد پہ دنیا ہے۔گھاٹیاں اُس کی ٹھوکر پر ہیں۔یہ عظمتِ انسان کا ترانہ ہے۔یہاں شاعر مجبولیت و مفعولیت کا شکار نہیں ہے،شاعر انسانی حیات کو لے کر عملی اور مثبت فکر کا حامل ہے، وہ Pro Active ہے۔یہاں اس نے دل اور خدا کی دوئی دور کر دی ہے۔یہاں وہ دل کے سامنے خود کو دیکھتا ہے،تو یہ سمجھتا ہے کہ میری ٹھوکروں کی زد میں زمانے کی گھاٹیاں ہیں،لیکن جب وہ اپنے آپ کو خدا کے روبرو پاتا

ہے، تو وہ خود کو پیکرِ عجز محسوس کرتا ہے۔ مجید امجد جہاں سفاک ہونے پر آتا ہے تو بہت سفاک ہو جاتا ہے۔ شاعری کے کُرے سے باہر نہیں جاتا۔ کرخت ٹھیکریاں، ان کٹھور ماتھوں کی، یہاں وہ ظاہر بینی اور ملائیت پر Comment کر رہا ہے۔ خداوندی کا تقاضا کیا ہے۔ غیر مشروط اطاعت۔ تو ہم اپنے مفادِ وابستہ وعنادِ پیوستہ کے تحت بہت کچھ مشروط کرنے کی خواہشات کے اسیر ہوتے ہیں۔ خدائی عبودیت کا حق ادا نہ کر سکیں یا اُس میں ہمارے کچھ مفادات یا ہماری کچھ مصلحتیں یا کوئی غرض لاحق ہو جائے یا پھر حرص و ہوس ہمارے نظامِ افکار و اقدار میں شامل ہو جائے، تو پھر شاعر یہی کہے گا، یہ، وہ ماتھے ہیں جو تیرے آگے جھک نہ سکے، ان کی گردنیں تیرے آگے جھکنے کے لیے بنی تھیں۔ ہر لکیر ایک الگ ٹکڑا کے مانند ہے۔ ہر لکیر ایک الگ ٹکڑا بناتی ہے۔ ماتھے کی لکیریں۔ ٹھیکریاں ایک ٹکڑا۔ شاعر نے یہاں ٹھیکریوں سے ایک امیج بنایا ہے جو ماتھے کی لکیروں سے تعبیر د عبارت ہے۔ گھاٹیوں جیسے کٹھور ماتھے، ٹھیکریاں۔

قدم قدم پہ یہ فاصلوں کے سنگم پر
بس اِک مجھی کو اس اَن مِٹ تڑپ سے حصہ ملا
تری جرس کی صدا میں ہیں رَت جگے جس کے
یہی تڑپ تری کایا، یہی تڑپ، مرا انت
جو اَنت بھی ہو، سو ہو، میں تو مٹی مٹی ہوں
دھڑکتی ریت کے بے اَنت جھکڑوں میں سدا
رواں رہیں، ترے محمل! مرے خدا، مرے دل(۶)

شاعر دائرہ در دائرہ بنا رہا ہے۔ وہ کسی ایک دائرے کا قیدی نہیں ہے۔ جیسے کھڑے پانی میں کنکر یا پتھر پھینکیں تو دائرہ در دائرہ لہریں بنتی ہیں۔ وہ دائرے بنا رہا ہے۔ جس میں ایک اور پہلو بھی ہے کہ جس ذرۂ ریت کو ہم بے مایہ یا بے قیمت سمجھتے ہیں۔ اس ذرے کے اندر بھی دل دھڑک رہا ہوتا ہے۔ وہ ذرہ زندگی کی علامت ہے۔ اس ذرے کے اپنے امکانات ہیں، جسے ہم ایک ریت کا ذرہ سمجھ کر نظر انداز کر رہے ہوتے ہیں، وہ زندگی کی علامت ہوتا ہے۔ وہ پوری کائنات ہے۔ کائنات کا جو بنیادی سالمہ ہے، یہ اس کو خراجِ تحسین (Tribute) پیش کرنے کا ایک انداز ہے۔ یہ آگ جسے سوزِ تپاں بھی کہا گیا ہے۔ میرے دُکھ، میرا

مقدر بھی ہیں اور یہ تیری آگ کی میٹھی آنچ ہی کی بدولت ہیں اور تیرے خزانوں کو کبھی خزاں نہیں۔ تیرے خزانوں پہ کبھی زوال نہیں آنے والا۔ مگر تیرے خزانوں سے مجھے تو ایک ریزۂ درد کے سوا کیا ملا ہے۔ جیسے فیض نے اپنی ایک غزل کے ایک شعر میں کہا ہے:

اِک فرصتِ گناہ ملی، وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے(۷)
(فیض احمد فیض)

یہ خدا سے ایک والہانہ شکوہ ہے۔ تیرے بے خزاں، خزانوں سے مجھے کیا ملا ہے۔ یہ ایک ''ریزۂ درد'' یہ جبر وقدر کا معاملہ یہاں آ گیا ہے۔ میرے لیے تو میری کمائی، میرا نصیبہ! میرا درد ہی ہے۔ وہ درد کی جو آنچ ہے، وہ تیرے بے خزاں، خزانوں سے ہی ملی ہے 'کھلیان' اناج، کا ڈھیر جس کو محفوظ کرلیا جاتا ہے اور جس کی ساری اوقات یہ ہوتی ہے کہ ایک شُعلے کی لپک پورے کھلیان کو جلا دیتی ہے۔ یہاں کھلیان، خرمنِ ہستی کا استعارہ ہے۔ یہ رُوحیں اپنے آپ میں ایک راکھ کا سمندر ہیں۔ یہ رُوحیں لالچ اور لوبھ کی روحیں ہیں، طمع کی روحیں ہیں۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام، لوبھ، لالچ اور مفاد پرستی پر قائم ہے مگر شاعر کا درد بے لوث تھا۔ میرا درد تو ایک عطیہ ہے، ایک نعمت ہے، لیکن میرے درد کی جو بے لوثی ہے، میرے درد کے اندر جو درویشی ہے، یہ روحیں اسے کھائے جارہی ہیں۔ یہ رُوحیں جو اسے کھائے جارہی ہیں، یہ رُوحیں اصل میں بدرُوحیں ہیں، لالچ کی بدرُوحیں ہیں، کلیت پسندی اور جبر کی بدرُوحیں ہیں۔ میں تو بے لوث ہوں، مجھے کوئی لوبھ اور لالچ نہیں ہے۔ ان بدروحوں اور نظامِ زر کا غلبہ اتنا ہے اور اس نظامِ زر کے کرداروں کی یلغار اتنی شدید ہے۔ اس نظامِ زر کا غلبہ اتنا ہے کہ میں ڈرتا ہوں کہ یہ میرے خلوص کا مول نہ لگا دیں۔ میں ڈرتا ہوں، کہیں یہ میری لگن کی یہ قیمت نہ لگا دیں۔ کہیں مجھے اپنے رنگ میں نہ رنگ دیں۔

کیچڑ کی مورت لوبھ اور لالچ سے بدنما اور کالی ہو جاتی ہے۔ لالچ، مفاد اور لوبھ پر مبنی نظامِ زر جو ہے۔ کیچڑ کی مورتیں یعنی انسان کا خراب ترین رُوپ ہیں۔ زر پرستی ریشم کا اثاثہ۔ کیپٹل ازم۔ یہ کیپٹل ازم جبریت اور کلیت پسندی پر مبنی نظام ہے جو حرص و ہوس کو مہمیز کرتا ہے۔ حریر بنیادی طور پر ستر پوشی کا کام نہیں کرتا۔ وہ بنیادی طور پر Show off کا کام کرتا ہے، وہ دولت کی نمائش کا ایک Symbl ہے۔

رختِ حریر، دولت کی علامت ہے۔ میرے پاس کیا ہے؟ جو میں اس نظامِ زر کا مقابلہ کروں، میں

اس نظامِ زر کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ میں اس نظامِ زر کا نہ تو کردار ہوں اور نہ اس نظامِ زر کا پجاری ہوں۔ میرے پاس تو محبت اور درد کی ایک کرن ہے۔

مجھے یہ اندیشہ ہے کہ یہ نظامِ زر کہیں مجھے میری پُونجی سے محروم نہ کر دے۔ میں اس نظامِ زر کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتا اور نہ میں اس نظامِ زر کی ہوس میں مبتلا ہوں، لیکن مجھے یہ اندیشہ ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کہیں میری پُونچی، میری دولت، میرا خزانہ مجھ سے نہ چھین لے۔ میری پونجی کیا ہے؟ درد کی پونجی ہے۔ یہ آگ مقصدِ کائنات کی آگ ہے۔ یہ شاعر کی امکان پسندی اور رجائیت ہے۔ ہر چند کہ وہ نظامِ زر کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا کمزور محسوس کر رہا ہے اور اس کے غلبے سے خوف زدہ بھی ہے، لیکن اس کے ساتھ اس کا یقین مضبوط ہے کہ جو کچھ بھی ہو کوئی مجھ سے میرا درد چھین نہیں سکتا کہ یہ نظامِ زر اور اس کے کردار مجھ پر غالب آ جائیں اور مجھ سے میرے درد کی متاع چھین لے۔ وہ ایک Thesis قائم کرتا ہے کہ اگر یہ ہو گیا تو کیا ہوگا؟؟ پھر ساتھ ہی ایک Counter Thesis قائم کرتا ہے۔ یعنی جب تک یہ سانس چل رہا ہے۔ میں اس نظام کے خلاف مزاحمت کرتا رہوں گا، میں ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔ میں درد کی پونجی کو سرِ بازار لُٹنے نہیں دوں گا۔ میں اس لوبھ اور لالچ بھری دنیا میں اپنے درد کے تقاضوں کو سنبھال کر رکھوں گا۔ میں اپنی صداقت کے اوپر اس نظام کو غالب نہیں آنے دوں گا۔

ابھی تو جلتی حدوں کی حدیں ہیں لا محدود،
ابھی تو اس مرے سینے کے ایک گوشے میں
کہیں، لہو کے تریڑوں میں، برگِ مرگ پہ اِک
کوئی لرزتا جزیرہ سا تیرتا ہے جہاں
ہر اِک طلب تری دھڑکن میں ڈُوب جاتی ہے
ہر اِک صدا ہے کوئی دُور کی صدا، مرے دل
مرے خدا، مرے دل(۸)

جلتی حدوں کی حدیں کیا ہیں؟ وہ جو جلتی ہوئی آگ ہے، سچے انسان اور تخلیق کار کے سینے میں، اس کے وجدان میں، اس کے احساس میں جو آگ ہے۔ یہ وہی آگ ہے جو اسے اس نظامِ زر کے آگے ہتھیار نہیں دالنے دیتی۔ یہ وہ آگ ہے جو مفاہمت نہیں کرنے دیتی۔ اس آگ کی صداقت پر اُس کو یقین

ہے۔ یہ آگ تخلیق اور درد کی آگ ہے جو non Compromizing ہے۔یہ، وہ آگ ہے جو سچ سے عبارت ہے۔ یہ مفاد پرستی کے نظام سے سمجھوتا یا مفاہمت کرنے سے روکتی ہے۔ یہ آگ درحقیقت شاعر کے ضمیر کی سچائی اور تخلیقی افکار سے روشنی لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مفاد پرستی پر مبنی نظام کا حصہ نہیں بنتا اور نہ ہی اس کا مرہونِ منت ہے۔ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر یقین رکھتا ہے جو صداقت سے عاری نہیں ہے۔

'لہو کے تریڑے' کیا اچھا ہے، کمال تخلیقی پیرائے میں آیا ہے۔خون جب جم جاتا ہے، اس کی پپڑیاں بن جاتی ہیں، اس کے بعد تڑخ جاتا ہے۔ یہ بہتا ہوا لہو نہیں ہے۔ یہ جما ہوا لہو ہے، جمنے کے بعد اس لہو میں دراڑیں آجاتی ہیں۔ 'کہیں لہو کے تریڑوں میں برگِ مرگ پہ اک/ کوئی لرزتا جزیرہ سا تیرتا ہے جہاں'

وہ فنا کے اندر ایک دیا روشن کر رہا ہے۔ مرگ صرف وہی نہیں ہوتی جو قضا کی صورت میں آتی ہے۔ جب اقدار مرجاتی ہیں۔ جب انسانیت مرجاتی ہے۔ جب انسان کا احساس مرجاتا ہے، یہ سب موت ہے۔ محض قضا ہی تو موت نہیں ہے۔ لرزتا ہوا جزیرہ شاعر کا درد ہے۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ اقدار مرگئی ہیں، انسانیت مرگئی ہے۔ اس کے باوجود اس کا درد زندہ ہے۔ اس کے اندر یقین وصداقت ہے جس نے اس کے درد کو مرنے نہیں دیا۔ اس کے اندر درد کی پونجی ہے جو درد کی ودیعت کی ہوئی ہے، جو اُسے اس کی حساسیت نے عطا ہوئی ہے۔ یہ درد ایک تخلیق کار کا درد ہے۔ یہ شاعر سے تخلیق اور انسانیت کا سفر طے کرواتا ہے، کہ میرا درد، 'سوزِ تپاں' وہ ہے جو آندھیوں اور مصائب کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتا ہے، سوز تپاں، میرے احساس اور میرے جذبے کی سچائی کو مرنے نہیں دے گا۔ بے شک چاروں طرف صدائے مرگ ہو، لیکن میرا درد اپنے آپ کو زندہ رکھتا ہے۔ وہ بھی ایک تیرتا ہوا جزیرہ ہے جو ڈوبنے سے انکار کر دیتا ہے۔ وہ وقت کے بہاؤ میں، لوبھ، لالچ اور حرص وہوس کے بہاؤ میں نہیں بہنا چاہتا، اس کا صداقت پر کامل یقین ہے۔ حرص و ہوس، لوبھ اور لالچ ایک طوفان بدتمیزی ہے۔ ایک سچا انسان، ایک تخلیق کار جو ایک ننھا سا جزیرہ ہے، وہ نظامِ زر کا حصہ بننے سے انکار کر دیتا ہے۔ تو اس کی قوت کیا ہے؟ کون سی چیز اس کو مہمیز کرتی ہے؟ یہ دُور کی صدا ہی اُس کی نامیاتی قوت ہے جو اس درد کے لرزتے ہوئے جزیرے کو، وقت کے تھپیڑوں میں جبر، ظلم، مفاد پرستی کے نظام، حرص وہوس، لوبھ، طمع اور لالچ کے خلاف طاقت عطا کرتی ہے، اس کا درد مرنے نہیں دیتی۔ وہ صدا ہی صداقت کی صدا ہے۔ جسے شاعر نے 'دُور کی صدا'' کہا ہے۔

یہ طلب حرص وہوس، طمع، مفاد پرستی، لالچ اور لوبھ کی طلب ہے، یعنی جزیرے کے چاروں طرف

پانی ہوتا ہے۔ یہ اس کو کنڈیمن (Condmn) کر رہا ہے۔ درد کوئی فریکل فارمیشن نہیں ہے۔ یہ ایک غیری مرئی کیفیت ہے جو اس جزیرے کو چاروں طرف سے لوبھ، لالچ، طمع کے پانی سے گھیرے ہوئے ہے، وہ غیر مرئی صدا جو اس کے درد کو ڈوبنے نہیں دیتی۔ وہ صدا، زندگی کی سچائیوں کی صدا ہے۔ وہ صدا، زندگی کے نمو اور روئیدگی کی صدا ہے، جس کا پشتی بان دل ہے اور دل خدا اور کائنات کا مظہر ہے اور اگر شاعر کی طلب ڈوب جاتی ہے تو اس کی ہر طلب اس کے دل کی دھڑکن میں ڈوب جاتی ہے۔ دل درحقیقت مظہرِ کائنات ہے۔ خدا دلوں میں جلوہ گر ہے۔

☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد مرتب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص ص ۴۱۷۔۴۱۸۔۴۱۹۔۴۲۰۔۴۲۱۔

۲۔ مادھولال حسین، کلامِ مادھولال حسین (لاہور: سچیت پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء)، ص ۳۳۔

۳۔ اظہار شاہین، کلیاتِ اظہار شاہین (لاہور: مکتبہ اُردو ادب، ۱۹۹۳ء)، ص ۸۷۔

۴۔ میر تقی میر، کلیاتِ میر (لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۹۷ء)، ص ۱۱۱۔

۵۔ محمد اقبال، بالِ جبریل (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۳۵ء)، ص ۱۳۲۔

۶۔ مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد، ص ۴۱۷۔

۷۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا (لاہور: کارواں ۲۰۰۰ء)، ص ۵۷۔

۸۔ مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد، ص ۴۱۸۔

مآخذ:

اقبال، محمد۔ بالِ جبریل: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۳۵ء۔

امجد، مجید۔ کلیاتِ مجید امجد۔ مرتب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء۔

حسین، مادھولال۔ کلام مادھولال حسین۔ لاہور: سچیت پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء۔

شاہین، اظہار۔ کلیاتِ اظہار شاہین۔ لاہور: مکتبہ اُردو ادب، ۱۹۹۳ء۔

فیض، احمد فیض۔ نسخہ ہائے وفا۔ لاہور: کارواں، ۲۰۰۰ء

میر، تقی میر۔ کلیاتِ میر۔ لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۹۷ء۔